Vol.4 No.3 2021

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

اردو افسانہ کیا ہے؟

طاہر محمود

پی۔ایچ۔ڈی، اُردو (سکالر)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر

صدر شعبہ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

Abstract

Shortstory, which quickly gained popularity in Urdu. As a result, questions are still raised today as to what is Short story? And how aspects of society are presented in it. Trends in Short story have now expanded this question to some extent. Because Short story now seems to cover all the subjects of life. It has changed many crores and then it has reached the place where the problems of today's man, the emotions contained in it and even the concepts of Short story. This myth sometimes emphasizes on symbols and sometimes by telling a story, sometimes its importance is judged by the writers and sometimes the readers' interest is measured by its value.

Key words: Aspects of society,Emotions,Value,Measured,Short story

لفظ افسانہ جیسے ہی ذہن میں آتا ہے بہت سی مختصر کہانیوں کا تصور دل و دماغ پر چھا جاتا ہے مگر پھر خیال آتا ہے کہ کیا ہر مختصر کہانی افسانہ کہلانے کا حق رکھتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ لفظShort story کو ہی افسانہ قرار دیا گیا ہے مگر افسانے میں ہر مختصر کہانی کو شامل نہیں کیا جاتا۔ بچپن میں جو ہم نے بادشاہوں کی مختصر کہانیاں پڑھیں تھیں وہ سب کی سب افسانے کی حدود سے باہر ہیں۔ ٹارزن کی کہانیاں اور بہت سی دوسری کہانیاں جو آج بھی بچوں کی دلچسپی کا باعث بنی ہوئی ہیں وہ افسانے میں شمار نہیں ہوں گی۔ چلیں اب لفظ افسانہ پر بات کرتے ہیں کہ اس میں کس طرح کے واقعات، یا کس نوعیت کی مختصر کہانیاں پیش کی جاسکتی ہیں۔ پلاٹ، کردار اور مکالمہ نگاری جیسے لوازمات پر بات کر کے میں پہلے سے جاری بحثوں کو طول نہیں دینا چاہتا۔ میں تو صرف اتنی سی بات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ افسانے میں بھی واقعات کا بیان ہے اور اس بیان میں حقیقت کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک کردار یا چند کرداروں کی مدد سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کا انجام قاری پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ان چند باتوں کی وجہ سے بچپن میں پڑھی گئی سبھی کہانیاں افسانے سے الگ ہو جاتی ہیں۔ پر حیرت تو اس بات کی ہے کہ انگریزی میں موجود لفظshort story کا ترجمہ مختصر کہانی ہی بنتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ افسانہ مختصر کہانی سے کچھ بڑھ کر ہے۔ تخلیق کار کا ذہن جب کچھ لکھنا چاہتا ہے تو وہ زیادہ تر دو جگہوں سے اپنا خام مال حاصل کرتا ہے ایک تو اپنے دل کی دنیا اور اس کے اندر موجود تصورات و خیالات دوسرا اس کے ارد گرد کا ماحول اور اس میں موجود چھپی ہوئی جذباتیت جس کا اظہار زندگی میں بھی کئی ایک مواقعوں پر دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ کہانی گو ہو یا قصہ گو، افسانہ نگار ہو یا ناول نگار ہر ایک اپنی کہانی میں واقعات کو پیش کرنے میں کئی نہ کئی جذبات کی رو میں بہہ کر واقعات کو اپنے دل کی خواہشات کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ اس لیے کہانی بڑی حد تک لکھاری کے ذہن کی عکاسی کرتی ہے جس کے لیے اتنا ثبوت کافی ہے کہ مختلف انداز سے لکھنے والوں کے الفاظ، طرز ادا اور بیان میں فرق ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا خاص رنگ ان کی دل کی دنیا کا عکاس ہے۔ افسانہ نگاروں کی ایک بڑی فہرست کو میں اس حوالے سے پیش کر سکتا ہوں جیسے دھنپت رائے (پریم چند) کے ہاں حقیقت کا بیان اور انداز سعادت حسن منٹو سے یکسر مختلف ہے حالانکہ دونوں کا مقصد زندگی کی حقیقتوں کو بیان کرنا ہے۔

افسانہ کو کئی ایک ناقدین نے مختصر افسانہ بھی کہا ہے ان کے نزدیکShort Story کا اصل ترجمہ مختصر افسانہ ہے۔ اس ترجمہ کے مطابقShort کا ترجمہ مختصر کرنے کے بعدStory کا ترجمہ افسانہ کیا گیا ہے اور افسانہ کو کہانی ہی قرار دیا گیا ہے۔ مگر جیسے بات کرتے ہوئے پہلے بھی سمجھایا گیا ہے کہ کہانی افسانہ نہیں ہے بلکہ افسانہ کہانی سے کچھ بڑھ کر ہے۔ اب الفاظ کی بہتات کہیے یا اردو کی وسعت کہ اس میں کئی طرح کے الفاظ موجود ہیں۔ جذبات کے متعلق جو باتیں کی گئی ہیں میں اس سے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جذبات کا بیانیہ انداز افسانہ ہے مگر شرط مختصر کہانی اور حقیقی زندگی کی اس پر لاگو ہو گی پھر بیانیہ کے بارے میں بھی کئی طرح کے لوگوں کے خیالات

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

میں تضاد موجود ہے۔ممتاز شیریں جیسی نقاد کے نزدیک تو بیانیہ وہ ہے جس میں مکالمہ کا انداز نہ ہو اور کسی دوسرے فرد یا افسانہ نگار کی اپنی زبان سے قصہ بیان ہو جائے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اردو ادب میں موجود افسانہ میں بیانیہ کا انداز اخباری رپورٹ اور کئی دوسرے انداز میں موجود ہے اور ان سب کو بھی بیانیہ شمار کیا جاتا ہے۔افسانے کی کامیابی کے لیے بیانیہ کا انداز ایک طرف افسانے کا موضوع بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے جس کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ یہ جتنا مختصر ہو گا اتنا ہی اچھا ہے مگر یاد رہے کہ اس کی اختصار پسندی اپنی جگہ مگر اس موضوع کو پڑھنے کے بعد انسانی ذہن میں افسانے کا ایک مبہم سا تصور آ جانا چاہیے کیونکہ موضوع ہی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ پھر افسانے کی ابتدائی سطور کو افسانے میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔رام لعل جیسے افسانہ نگار بھی جب کسی دوسرے افسانہ نگار کا افسانہ پڑھنے لگتے ہیں تو ان ابتدائی سطور کے بعد فیصلہ کر لیتے ہیں کہ انھیں یہ افسانہ پڑھنا چاہیے یا نہیں۔

افسانہ جب موضوع اور بیانیہ کی بنیادی شرائط پوری کر لیتا ہے تو اس میں کردار نگاری کی شرط لگائی جاتی ہے مگر کیونکہ افسانہ معاشرے کے کسی ایک موضوع یا اکائی کا بیان کہلاتا ہے۔اس لیے اس کا آغاز،وسط اور انجام بڑی اہمیت کا حامل ہے جس طرح آغاز کی سطور اہم ہیں اسی طرح اختتام کی سطور بھی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں اور یہی سطور قاری پر ایک سحر طاری کرتی ہیں جس کے باعث قاری بار بار اس اختتام کے متعلق سوچتا ہے اور اس ایک واقعہ سے اس کے ذہن میں کئی طرح کے تصورات کو ابھارتا اور کئی باتیں اس کے ذہن کو گھیر لیتی ہیں۔ ہمارے ہاں افسانے نے مختلف انداز اپنائے کبھی یہ افسانہ حقیقت نگاری کی طرز پر چلا تو کبھی اس نے رومانوی انداز کو اپنایا پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انگارے کی اشاعت نے اردو افسانے کو جذبات نگاری اور طنز سے آگاہ کیا اس کے بعد اشتراکیت کے زیر اثر وہ وقت آیا جب اردو میں ایک باقاعدہ تحریک کا آغاز ہوا اس تحریک کو ترقی پسند تحریک کہا گیا۔ یہ تحریک ادب پر اپنے اثرات گہرے کرتی گئی یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اب یہ تحریک پروپیگنڈا محسوس ہونے لگی۔ کرشن چندر جیسے افسانہ نگار کے افسانے بھی اس پروپیگنڈا کا حصہ بن گئے جس کے باعث تخلیقی جوہر مقید ہو گیا۔ قائم کردہ حدود نے اردو افسانے کو تخلیق کے درجے سے ہی گرا دیا۔ مگر آزادی کے بعد انسانیت کی حقیقت کھلی تو جذباتیت کا رنگ افسانے میں پھر سے زور پکڑ گیا۔ منٹو جیسا افسانہ نگار حقیقت نگاری کے جدید رنگ میں رنگا ہوا دکھائی دیا۔ اور اسی تاثر نے جدیدیت کی بنیاد ڈالی جس کے تحت علامتوں کو فروغ ملا کہانی میں شاعری کے عناصر نے اپنا رنگ جمایا اور تجریدیت کو افسانے کا گوہر سمجھا جانے لگا مگر اس علامتی انداز کے باعث کہانی کہیں گم ہو گئی مابعد جدیدیت کے حوالے سے بہت سے لوگ کہانی کی واپسی کا غل مچاتے دکھائی دیے۔ گویا افسانہ کئی رنگ اور کئی چولے بدلتا رہا مگر حقیقت حال یہ ہے کہ آج بھی افسانہ ہر رنگ میں موجود اپنے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیے ہوئے۔اور افسانہ کیا ہے؟ کی بحثیں آج بھی جاری ہیں گویا اس کا وجود آج بھی ایک سوال ہے اور اس کی کھوج جاری ہے۔

ڈاکٹر صفات احمد علوی افسانے کے موضوع پر بات کرتے ہوئے اس کی تعریفات کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی درست اور مکمل نہیں پھر خود افسانے کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ”میری ناچیز کی رائے میں افسانہ ایسا نثری بیانیہ ہونا چاہیے جو کسی سچے واقعے اور انسانی زندگی کے مشاہدے کی بنا پر لکھا گیا ہو، جہاں مشاہدے کو بلا کسی دیگر مشاہدے یا واقعات سے ملوث کیے اس طرح من گھڑت بوطیقائی انداز سے پیش کیا جائے کہ قاری کی توجہ کو اپنے میں اس طرح جذب کر لے جس طرح کچی مٹی پانی کو۔ جس طرح اس عمل کے بعد زمین پر گرے ہوئے بیج سے اکھوا پھولتا ہے، اس کی قرات سے قاری کی سوچ کی بہاروں میں ایسی کونپلیں پھوٹیں جس اس کے شعور کو مثل چھتنار بنا دے اور اسے پھول و پھل بخشے۔“(۱)

اس تعریف سے افسانہ ایک ایسا بیانیہ دکھائی دیتا ہے جس میں واقعات مشاہدے کی بنا پر فروغ پائیں اور یہ قاری کے ذہن میں نئے نئے خیالات کو ابھارنے کا فریضہ بھی انجام دیں۔صفات احمد علوی کی اس لمبی چوڑی تعریف میں بھی افسانے کی مکمل آگاہی نہیں ملتی کیونکہ افسانہ میں لازم نہیں کہ قاری کی سوچ کو نیا رنگ ملے ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ پرانے خیالات کو جانچنے کے نئے زاویے سامنے آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ واقعات اور باتیں جس کو قاری عام حالات میں سننا بھی گوارا نہ کرتا ہو افسانے کی رو روانی میں وہ سب کچھ بڑے آسانی سے پڑھ جائے۔

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

آج کے دور میں افسانے نے جہاں خیالات کو نئے نئے رنگ عطا کیے ہیں وہیں اس کے موضوعات میں وسعت آتی چلی گئی ہے۔ آج کے موجودہ قاری کے لیے افسانے کے کئی رنگ موجود ہیں اور افسانہ نگار بھی پرانے نئے سبھی انداز اپنائے ہوئے ہیں۔ موجودہ دور میں افسانہ پرانی نئی سبھی روایتوں کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اُردو افسانے کے حوالے سے پاکستان اور انڈیا میں بہت کام ہو چکا ہے مگر افسانے کا موضوع ایسا ہے کہ اس پر نت نئے انداز سے کام ہو رہا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز ابھی جاری ہے۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت، ترقی پسندی اور یہاں تک کہ حقیقت نگاری کا رنگ بھی آج کے افسانوں میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔ اردو افسانے پر فلسفہ کی بحثیں شروع ہوئی تو کہانی الجھاؤ کا شکار ہوتی گئی مگر جہاں علامت نگاری کے تحت افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ پیدا ہوا تھا آج پھر افسانے میں کہانی الجھاؤ کا شکار ہو گئی ہے۔ کچھ افسانہ نگار حالات کی بدلتی ہوئی روش کو دیکھ کر سادگی پسندی اور حقیقت نگاری کے رنگ کو اپنا رہے ہیں اور کچھ لوگ جن کی شہرت کا باعث علامت نگاری کی تحریک بنی تھی ان کے ہاں آج بھی وہی رنگ ہے پاکستان میں اس رنگ کو رشید امجد نے خوب ترقی دی ہے۔

علامتی افسانہ نگاری میں آمرانہ ظلم وستم پر چوٹ رشید امجد کا من پسند موضوع ہے اور وہ ہر طرح کے معاملات پر طنز کرنا خوب جانتے ہیں ان کے ہاں کچھ رجائیت دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے ہاں علامتیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ ان کا افسانہ "سناٹا بولتا ہے" میں دو کرداروں کو دکھایا گیا ہے جو گٹر میں گر جاتے ہیں اور انھیں معلوم نہیں کہ وہ کیسے یہاں تک پہنچ گئے۔ وہ اپنے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتے ہیں مگر ان کو کہیں بھی راستہ نہیں ملتا۔ وہ اس گٹر کی بو میں ہی تازہ ہوا کی خوشبو اور احساس کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ انھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ واقعہ ہی تازگی ہے یا وہ اس ماحول کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ تعفن اور بو ان کے بدن میں رچ بس گئی ہے۔ وہ اوپر سے گزرنے والے لوگوں کی آوازوں کو بھی سنتے ہیں اور اس کے مطابق وقت کا اندازہ لگاتے ہیں کہ کیا وقت ہوا ہے۔ وہ صبح کو محسوس کرتے ہیں، دن کی کیفیت کو جانچتے ہیں اور رات کے سناٹے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ماچس سے تیلی جلا کر کچھ چیزوں کو دیکھتے ہیں اور اسی طرح انھیں کچھ گوشت کی مانند گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے جسے ایک شخص اپنا بچہ قرار دیتا ہے۔ یہاں انھیں بہت سے بچوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے جو ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ یہاں کیسے آئے۔ تو یہ بتاتے ہیں کہ ان کا پاؤں پھسل پڑا اور وہ اس گٹر میں گر گئے۔ بچے ان پر ہنستے ہیں اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ یہاں کیسے آئے تو وہ غباروں میں آنے کے حوالے سے انکشاف کرتے ہیں گویا کونڈم کے استعمال سے ان کا وجود بنا۔ اس پر ان دونوں میں سے ایک کو یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید اس کی ماں نے بھی اسے ایسے ہی جنا ہو گا۔ ان دونوں کرداروں کا پہلے گرنے پر بھی جھگڑا ہوتا ہے اور وہ لڑ کر جب نڈھال ہو جاتے ہیں تب پھر چل پڑتے ہیں۔ یہاں موجود دونوں کے مکالمے موضوع کی اہمیت کو اجاگر کرنی کی ایک کاوش ہیں۔ اس افسانے میں سیاسی نقطہ نظر کو پیش کرنے کی سعی بھی کی گئی ہے کہ کس طرح ایک لیڈر دوسرے کو نکلنے کا موقع دیتا ہے۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

ہمارے سروں پر آوازوں کے بادل تیرتے ہیں۔

ایک آواز۔۔۔ "میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟"

دوسری آواز۔۔۔ "وہی جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے۔"

تالیاں، نعرے، تحسین کا شور؛

وہ کہتا ہے۔ "بادشاہ نے بادشاہ کے ساتھ جو سلوک کرنا تھا کر دیا، مگر ہم کہاں ہیں؟"

"ہم۔۔۔ میں اس کا شانہ تھپتھپاتا ہوں۔۔۔ "بادشاہوں کے کھیل میں ہم کوئی چیز نہیں ہوتے، بس ہم تو کھلے مین ہول کے خواب ہی دیکھتے ہیں۔"(۲)

رشید امجد نے دونوں کی گفتگو سے واضح کیا ہے کہ یہ سیاسی لیڈر اور یہ آمرانہ نظام قائم کرنے والے مارشل لا کے ڈکٹیٹر صرف اور صرف مفاد کے بندے ہیں اور ایک دوسرے کے مفادات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ انھیں عوام کی ضروریات اور مسائل سے کوئی غرض نہیں۔ ان کے اس انداز پر ڈاکٹر شفیق انجم یوں رقم طراز ہیں

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

رشید امجد کے ہاں کرب ناک مسخ چہرے والی بے خواب ویرانی ایک اہم موضوع ہے۔اس ویرانی میں کہانی خود ان کی اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے اور ارد گرد پناہیں تلاش کرتی کائناتی وسعتوں میں پھیل جاتی ہے۔ان کے ہاں "وہ" اور "میں" دو ایسے اہم کردار ہیں جو اس ویرانی میں بھٹکتے پھرتے ہیں کبھی "وہ"، "میں" کو تلاش کرتا ہے اور کبھی "میں"، "وہ" کو اور کبھی دونوں خود اپنے آپ کو تلاش کرنے لگ جاتے ہیں۔ہر تین صورتوں میں لاحاصلی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔اور کچھ پانے کی بجائے وہ خود کو بھی کھو بیٹھتے ہیں۔یہ ماحول کے جبر میں فرد کی حیثیت کے معدوم ہو جانے کا مسئلہ ہے۔ شخصیت جب ٹکڑوں میں بٹ جائے تو پہچان باقی نہ رہے تو ہونے نہ ہونے کی اذیت کلبلانے لگتی ہے۔اور یوں وہ اجاڑ اداسی اور ویرانی جنم لیتی ہے جس میں کشف اور گیان کے سوتے خشک اور لفظوں کے کشکول خالی ہو جاتے ہیں۔(۳)

رشید امجد نے آج کے دور میں ٹیکسوں کے بوجھ اور مہنگائی کی وجہ سے آج کے دور میں انسان کو خون کے رشتوں سے بھی اکتائے ہوئے دکھایا ہے۔"بیزار آدم کے بیٹے" میں سیاسی صورت حال سے فرد کی زندگی میں جو تبدیلی رونما ہوتی ہے اس کا اظہار کیا گیا ہے۔جب ایک فرد اپنی ہی اولاد کو گدھ سمجھنے لگتا ہے جو اس کا خون چوسنے میں لگے ہوئے ہیں۔یہاں فرد کی اپنی شناخت بھی گم ہو چکی ہے۔ یہاں انسانوں کی ریاکاری سے پردہ اٹھاتے ہوئے "ا" اور "ب" کے باہم جھگڑے میں جہاں "ب" اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ "ا" نہیں کیونکہ "ا" کبھی اپنی پٹاری نہیں کھول سکتا تھا۔اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ ہم اپنے بنائے ہوئے حصار سے باہر آنا ہی نہیں چاہتے۔اس افسانے کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

میں "ا" نہیں۔۔۔میں اسے بتاتا ہوں۔۔۔"ایک رات "ا" اپنا جسم مجھے دے گیا تھا۔میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں یہ راز کسی کو نہ بتاؤں گا۔ب کو بھی نہیں۔وہ کھلکھلا کر ہنستا ہے۔

میں حیرانی سے اسے دیکھتا ہوں۔۔۔"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

وہ ہنستا ہی چلا جاتا ہے پھر کہتا ہے۔۔۔"تمہارے خیال میں میں ب ہوں؟

مجھے لفظ نہیں سوجھتے۔۔۔"تو تم بھی"

وہ ہنستے ہنستے مجھ پر گر پڑتا ہے۔میں اسے دیکھے چلا جاتا ہوں۔وہ سر ہلاتا ہے۔۔۔"ب" بھی ایک رات اپنا جسم مجھے دے گیا تھا۔"

اس کا مطلب ہے، ج۔د۔س۔اسے ی تک سبھوں کے جسموں میں دوسرے رہ رہے ہیں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے، میرے چاروں طرف خالی پیپے لڑھک رہے ہیں۔سڑکوں، گلیوں، گھروں، ہوٹلوں۔۔۔۔ہر جگہ خالی پیپے بج رہے ہیں۔

کھوکھلا پن۔۔۔۔کھوکھلا پن

ب ہنس رہا ہے، میں ہنسنے لگتا ہوں۔

ب لہک لہک کر گاتا ہے۔

ہم سب گنہگار ہیں۔

سب بے ایمان ہیں۔

سب ہیں منافقت کے سمندر کی مچھلیاں!(۴)

علامت نگاری کی تحریک کے تحت جہاں ادب میں جدت کی باتیں زبان زد عام ہوئیں۔وہیں کہانی پن کا مسئلہ اس دور میں سر اٹھانے لگا۔یہ تصور عام ہونے لگا کہ افسانہ صرف اہل ادب لوگوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے اور اس کا عام قاری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اس حوالے سے یہ باتیں عام کہیں جانے لگیں کہ علامتی افسانے کو عام قاری سمجھنے سے قاصر ہے اور جواز یہ پیش کیا گیا کہ علامتیں بہت گنجلک ہیں۔دراصل علامت نگاری کی اس تحریک کے زیر اثر بہت سے نئے لکھنے والوں نے افسانے کو ماورائی چیز بنا کر رکھ دیا جس کے باعث افسانہ ایبسٹریکٹ آرٹ کی مانند دکھائی دینے لگا۔جس کو سمجھنا بہت دشوار اور بہت سی حالتوں میں ناممکن تصور کیا جاتا ہے۔پھر وہ دور آیا کہ کہانی کی واپسی کو یقینی بنانے کی بھرپور کاوشیں شروع ہو گئیں گویا ایک مرتبہ پھر افسانہ اپنی پرانی روش پر چلنے کو تیار ہو گیا۔اب افسانے کو بنیادی سوال پھر پیدا ہوا کہ افسانہ کیا ہے؟کیا افسانہ ایسا واقعہ یا قصہ کا بیان ہے جو تزکیہ نفس کا باعث بنے یا ایسی علامتوں کا اظہار ہے جو انسان کو غور و فکر کی دعوت دیں۔اب افسانہ کہانی تو رکھنے لگا مگر کوشش کی جانے لگی کہ یہ کہانی پرانے انداز سے قدرے مختلف ہونی چاہیے مگر علامتی نظام اس پر اپنے اثرات گہرے بھی نہ کرنے پایا ۔جس کے نتیجہ میں ایسی کہانیاں لکھیں گئیں جو کہانی ہوتے ہوئے بھی کہانی دکھائی نہ دیتی تھیں۔گویا ان کے موضوعات عام زندگی کے موضوعات سے قدر مختلف تھے۔اس مصروف انسان کی زندگی میں اب وہ وقت آ چکا تھا جہاں وہ خود کو ہر لمحہ تنہائی کا شکار تصور کرنے لگا تھا۔اردگرد موجود لوگوں کی کثرت میں وہ تنہا ہے کیونکہ یہاں کی مادیت پسند دنیا میں لوگ انسانی جذبات سے زیادہ جنسی خواہشات سے جڑے ہوئے ہیں جہاں رشتے لالچ کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ہر قدم پر ایسے لوگوں کی بھرمار ہے جو دوسروں کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرنا جانتے ہیں۔اس لیے ایسے معاشرے میں تنہائی کا احساس شدت اختیار کر گیا ہے۔گویا اس دور میں جو افسانے لکھے گئے وہ اسی موضوع کے زیر اثر لکھے گئے۔فرد کی تنہائی کے اس موضوع سے متعلق یہ بات بھی کہی جاتی رہی ہے کہ یہ موضوع یورپ سے مستعار لیا گیا کیونکہ ہمارے ہاں تو آج بھی جوائنٹ فیملی سسٹم (مشترک گھرانے کا تصور) موجود ہے۔مگر ایک ادیب کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اشتراکی گھریلو نظام میں بھی فرد تنہائی کا شکار ہو سکتا ہے کیونکہ بہت سے لوگوں کے رویے ایسے ہوتے ہیں جو کسی فرد کو تنہا کر دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں یہ ناصر کاظمی کے تصور جیسا ہی ہے جہاں اس کو لوگوں کی بھیڑ میں کوئی انسان کوئی اپنا دکھائی نہ دیتا تھا۔

فرد کی تنہائی میں ایک نقطہ جو زندگی کا حسین نقطہ دکھائی دیتا ہے وہ اس کی زندگی میں محبت کا وجود ہے مگر یہ محبت کا وجود بھی آج مطلب پرستی کی بھینٹ چڑھ چکا ہے اس حوالے سے مظہر الاسلام کا افسانہ "آؤ بچھڑ جائیں" میں ہمیں محبوب کا وہی رنگ دکھائی دیتا ہے جہاں مظہر الاسلام اپنے محبوب کو کہتے ہیں کہ جب آدھی عمر گزر جائے گی تو پھر اس میں بچھڑ جانے کا حوصلہ نہیں رہے گا اس لیے ابھی ہی بچھڑ جانا بہتر ہے۔یہاں ان عورتوں کی کہانی کا بیان ہے جو اپنی زندگی کے لیے مرد کا انتخاب خود کرتی ہیں مگر پھر جلد ہی وہ اس مرد سے تنگ آ جاتی ہیں کیونکہ مظہر الاسلام کے نزدیک یہ عورت مادیت پسند ہوتی ہیں اور جب انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے بڑے بڑے خواب اس مرد کی وساطت سے پورے نہیں ہو سکیں گے تو وہ اس مرد سے بیزار ہو جاتی ہیں۔فرد کی تنہائی میں ایسی صورت حال بھی بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے جب اس کی زندگی کے دوران لوگ اس سے اکتا جاتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہی محبوب جس نے اپنے عاشق کا انتخاب خود کیا تھا بیزار ہو جاتا ہے تو عاشق کی زندگی میں تنہائی اور بے بسی کا شکار ہو جاتی ہے۔انسان کی یہ بے بسی فراریت کی طرف ایک قدم بھی ہے۔گویا ایسے میں ہر وہ شخص جو اس تنہائی اور بیزاری کا شکار بنتا ہے وہ فرار کا رستہ اختیار کرتا ہے۔اس فراریت کے دوران میں اس کی تنہائی اور بھی دوچند ہو جاتی ہے۔گویا مظہر الاسلام نے ایسی روایات پر طنز کرتے ہوئے پہلے ہی بچھڑ جانے کا مشورہ دیا ہے۔

بشریٰ اعجاز نے بھی فرد کی تنہائی کے موضوع کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اس حوالے سے ان کا افسانہ "بارہ آنے کی عورت" خاصے کی چیز ہے۔جہاں دکھایا گیا ہے کہ ایک شخص روپے کی حوس میں اپنی ہستی بستی زندگی کو خیر آباد کہہ کر چلا جاتا ہے اور اس کی عورت کسی دوسرے مرد سے تعلقات قائم کرتی ہے جب وہ شخص بارہ آنے کی کال پر اس کی تمام لٹائی ہوئی دولت کا قرض چکا دیتا ہے تو اس عورت کو اپنے وجود سے نفرت ہو جاتی ہے۔گویا ایسے خاندانی اکائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔آج بھی ہمارا معاشرہ دولت کی حوس کے باعث ایسی ہی کیفیات سے دوچار ہے۔

فرد کی تنہائی کے بعد عدم تحفظ کا احساس بھی ایک ایسا موضوع ہے جس نے اردو افسانے میں جگہ پائی ہے۔اس موضوع کے تحت تقریباً ہر دور میں افسانے لکھے جاتے رہے ہیں مگر یہ عدم تحفظ کا احساس اس وقت شدت اختیار کر گیا جب انسانی رشتوں کی قدر و قیمت ختم ہونے لگی۔پاکستان میں یہ دور دوسرے مارشل لاء کے بعد دکھائی دیتا ہے۔گویا اس طرف افسانہ اب کہانی رکھتے ہوئے ان موضوعات سے ٹکرانے لگا جو جدید ہونے کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کے ناسور ہیں جنھوں نے اس

معاشرے کو ہرس و حوس کی بھینٹ چڑھا کر تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔اس عدم تحفظ میں جس طرح کے خوف نے جنم لیا ان میں جدید آلات کے نقصانات کا خوف سب سے بڑا خوف ہے خاص طور پر بجلی سے چلنے والی چیزیں جہاں بہت سی سہولتوں کا باعث بنی وہیں انسان میں بجلی کے خوف نے بھی سر اٹھایا کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اس بجلی سے کئی لوگوں کو لقمہ اجل بنتے دیکھا تھا۔اس خوف کو مشتاق قمر اور رشید امجد نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔اسی طرح عدم تحفظ کے تحت ہر وقت گرفتار ہو جانے کسی کا آپ کا پیچھا کرنے اجنبی لوگوں سے خوف محسوس کرنے اور ایسی کئی دوسرے وہم ہیں جن کو پیش کر کے اس بات کا بھی احساس دلایا گیا ہے کہ اس معاشرے میں لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے والے ادارے مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔کیونکہ ان اداروں میں لالچ ہرس و ہوس کے باعث کسی بھی فرد کو بغیر کسی وجہ کے بھی گرفتار کیا جا سکتا ہے۔خاندان کی اکائی کے ختم ہوتے ہی رشتوں کا لحاظ بھی ختم ہو گیا ہے جس کے باعث ہر شخص دوسرے سے خوف زدہ ہے اسے عدم تحفظ کا احساس گھیرے ہوئے ہے۔گویا اس طرح افسانے کا ایک رخ عدم تحفظ کے احساس کا اظہار بھی ہے۔اسی عدم تحفظ سے قنوطیت اور یاسیت جیسے عناصر نے جنم لیا کیونکہ شر کا خیر پر حاوی ہونا اس کا سب سے بڑا سبب ہے۔آج انٹرنیٹ اور موبائل کی جدید ایجادات نے جہاں فاصلوں کو ختم کر دیا ہے وہیں ان جدید ایجادات سے ایک ہی گھر میں رہنے والے ایک دوسرے سے لاتعلق ہے مگر کئی ایک مجبوریوں کے تحت رہنے پر مجبور ہیں اور سر جھکائے اپنا اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔جیسے یاجوج و ماجوج اپنا کام کر رہے ہیں۔

"کہاں؟ماجوج نے ٹوکا۔

یار نیند تو آ نہیں رہی۔میں نے سوچا کہ چلو چل کے دیوار ہی کو چاٹیں

فائدہ؟

فائدہ تو کچھ نہیں ہماری ناتواں زبانیں اس اونچی ہیبت بھری دیوار کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

پھر یہ لاحاصل عمل کیوں کیا جائے؟

یار!مجھے تو اب سب کچھ لاحاصل اور لایعنی نظر آتا ہے،مگر ٹھالی سے بیگار بھلی۔کم از کم رات تو کٹے

گی۔(۵)

گویا ہم بھی زندگی کا یہ بے گار صرف اور صرف زندگی گزارنے کے لیے کر رہے ہیں اور ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس پیٹ بھرنے کے لیے ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب کا سب بے کار ہے اور اس سارے عمل کا کوئی حاصل نہیں ہے مگر ہم بھی یاجوج و ماجوج کی طرح مجبور ہیں اور دن بھر خود کو تھکا کر اس زندگی کو گزارنے میں لگے ہوئے ہیں۔

گویا اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے نئے موضوعات افسانے میں شامل ہوتے گئے اور اس کا کینوس وسعت اختیار کرتا چلا گیا جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تصور نے بھی اردو افسانے میں اپنا رنگ دکھایا ہے اور آج کا افسانہ جس کے متعلق سوال جو ابتداء میں اٹھایا گیا تھا کہ افسانہ کیا ہے۔اس پر کئی ایک رائے قائم ہو سکتی ہیں کیونکہ افسانہ صرف ایک بیانیہ ہی نہیں بلکہ ایک نشست میں ادا ہونے والا ایسا موثر بیان ہے جو آغاز سے ہی اپنے قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے اور پھر قاری اس کے انجام تک جا پہنچتا ہے اور انجام دیکھنے کے بعد بھی اس کے ذہن میں کئی ایک تصورات سر اٹھانے لگتے ہیں وہ اپنی سوچ کے سمندر میں ڈوب کر قلم کار کے اس زاویے کو پانے کی کوشش کرتا ہے جس کے حصول کی خاطر قلم کار نے یہ افسانہ لکھا تھا۔گویا قصہ المختصر افسانہ کسی معاشرے میں موجود فروغ پانے والی راویات میں پنپنے والی ایسی کہانی ہے جو معاشرے کی عکاس بھی ہے اور کئی ایک مقامات پر معاشرے کے ناسوروں پر طنز بھی۔

حوالہ جات

ا۔ صفات احمد علوی،ڈاکٹر،"افسانہ" مشمولہ "افسانے کے مباحث"مرتب:ایم اے فاروقی،بک ٹائم اؤ،اُردو بازار،کراچی،صفحہ نمبر 56

Vol.4 No.3 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

۲۔ رشید امجد،ڈاکٹر"سناٹا بولتا ہے"مشمولہ: گملے میں اگا ہوا شہر، نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،اشاعت مئی 2015ء،ص:83 تا 84

۳۔ شفیق انجم،ڈاکٹر،اُردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں)،پورب اکادمی،اسلام آباد،فروری 2008ء،ص:269

۴۔ رشید امجد،ڈاکٹر"بے زار آدم کے بیٹے"مشمولہ:عام آدمی کے خواب،پورب اکیڈمی،اسلام آباد،اشاعت 2010ء،صفحہ نمبر 136 تا 137

۵۔ انتظار حسین،رات،مشمولہ،مجموعہ انتظار حسین،سنگ میل پبلشر،لاہور،اشاعت 2007ء،صفحہ نمبر 700 تا 701۔

کتابیات

ا۔ایم فاروقی (مرتب)،افسانے کے مباحث،بک ٹائم اوٗ،اُردو بازار، کراچی،

2۔رشید امجد، گملے میں اگا ہوا شہر، نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،2015

3۔شفیق انجم،ڈاکٹر،اُردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں)،پورب اکادمی،اسلام آباد

4۔رشید امجد،ڈاکٹر،عام آدمی کے خواب،پورب اکیڈمی،اسلام آباد،اشاعت 2010ء

5۔انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین،سنگ میل پبلشر،لاہور،اشاعت 2007ء